کتاب	:	**دینی مدارس: روایت اور تجدید (علماء کی نظر میں)**
مؤلف ومرتب	:	**ممتاز احمد**
ناشر	:	**ایمل مطبوعات – اسلام آباد**
سال اشاعت	:	**۲۰۱۲ء**
صفحات	:	**۲۰۶**
قیمت	:	**۵۹۰ روپے**
تبصرہ نگار	:	**ڈاکٹر سفیر اختر**☆

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے سانحے کے بعد عراق اور افغانستان کے خلاف امریکی جارحیت کے جلو میں جو موضوعات بوجوہ سب سے زیادہ زیر بحث رہے، اُن میں سے ایک برعظیم پاکستان و ہند میں دینی مدارس کا نظام ہے۔ دینی مدارس، ان کی تاریخ، ان کے نظم ونسق، اُن کی مالیات، اُن کے نصابات، اُن کے معاشرتی اثرات اور حالیہ عسکریت پسندی میں اُن کے موہوم یا واقعی کردار کے بارے میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اگر اِس سب کا احاطہ کیا جائے تو متوسط ضخامت کی ایک مجمل ببلیوگرافی مرتب ہوسکتی ہے، مگر اِس ساری سعی کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ان تحریروں کا بڑا حصہ فنی تحقیق و مطالعہ سے زیادہ سطحیت، مبالغہ آرائی اور پروپیگنڈے پر یقین رکھنے والے صحافیوں اور ''ماہرین'' کی کاوشوں کا حاصل ہے۔ خود اہلِ مدارس یا مدارس کی مثبت روایت کا ادراک رکھنے والوں کی جانب سے جو کچھ لکھا گیا، اِس پر ردِعمل کی نفسیات اِس حد تک حاوی ہے کہ اُن کے نزدیک ''مدارس جہاں ہیں، اور جیسے ہیں'' اُن کا اِسی شکل میں پھلتے پھولتے رہنا ہی ضروری ہے۔

مذکورہ صورتِ حال میں جناب ممتاز احمد کی مرتبہ زیرنظر کتاب___ دینی مدارس: روایت اور تجدید (علماء کی نظر میں)___ ایک نہایت سنجیدہ کاوش ہے جس میں دینی مدارس سے وابستہ اور اِس روایت سے بڑی حد تک آگاہ ۱۵ اہلِ فکر سے براہِ راست حاصل کردہ معلومات شامل ہیں۔ یہ معلومات زیادہ تر ۱۹۷۵ء میں حاصل کی گئی تھیں، جب اس دور کی حکومت علماء کے مسجد-مدرسہ نیٹ ورک کی قوت سے کچھ پریشان تھی۔ علماء کے ساتھ گفت و شنید میں مدارسِ دینیہ کے مقاصد، ان کے نصاب، اور اس میں اصلاح، طلبہ کے سماجی و

☆ سابق چیف ایڈیٹر، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IRI, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

اقتصادی پس منظر اور فارغ التحصیل نسل کی اجتہادی صلاحیتوں کے بارے میں اُن سے سوالات پوچھے گئے، اور انہی بنیادی سوالات کے تحت کچھ ذیلی مباحث پر گفتگو ہوئی۔ علماء کرام جو عمر بھر مدارس کی فضا میں رہے، اُنہوں نے بحیثیتِ مجموعی مدارس کے ماحول پر اطمینان کا اظہار کیا، البتہ جو اہلِ علم جدید تعلیمی اداروں کے پروردہ تھے، یا ان سے راہ و رسم رکھتے تھے، وہ دینی مدارس کے احوال سے چنداں مطمئن نہ تھے۔ اُن کے نزدیک دینی مدارس کے طلبہ ذہنی اعتبار سے پس ماندہ ہیں، اُن کا ماحول ناقص ہے، فرقہ واریت عام ہے، اور وہ دین اسلام کے احیاء وتجدید میں کوئی کردار ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کے نزدیک اصلاحِ حال ضروری ہے، اور اُنہوں نے اس سلسلے میں کی گئی بعض کاوشوں کی مثالیں بھی دی ہیں۔

مدارس کی فضا میں ۱۹۷۵ء سے اب تک انتظامی سطح پر کچھ تبدیلیاں آئی ہیں، یا پہلے سے تبدیلی کا جاری عمل منطقی نتیجے پر پہنچا ہے۔اب مسلک کی بنیاد پر مدارس کے الگ الگ وفاق قائم ہیں، اوران کے درمیان تعاون کی شکل بھی موجود ہے۔نصاب میں درجہ بندی کی گئی ہے، اور اِس کے مطابق اسناد طے کی گئی ہیں، مرکزی سطح پر امتحانات کا اہتمام کیا جاتا ہے، اور اِسی حوالے سے مدرسے کی جگہ متعلقہ وفاق سند جاری کرتا ہے، یا مدرسے کی سند کو وفاق کی تائید حاصل ہوتی ہے۔ اِسی طرح مدارس، اور بالخصوص بڑے شہروں کے باوسائل مدارس میں صفائی ستھرائی کا معیار بتدریج بہتر ہوا ہے۔ مدارس جنہوں نے تخصص کے شعبے قائم کیے ہیں،ان کی تعداد بڑھ گئی ہے، اورانہوں نے اپنے ہاں جدید تعلیم یافتہ افراد سے استفادے کی روایت بھی ڈالی ہے۔ کمپیوٹر کا استعمال عام ہوا ہے، تاہم اِس پیش رفت کے باوجود بحیثیتِ مجموعی فرقہ وارانہ تعصّبات کم نہیں ہوئے، بلکہ مسالک کے اندر ٹوٹ پھوٹ کے نتیجے میں انتہا پسندانہ زاویۂ نظر رکھنے والوں کو تقویت حاصل ہوئی ہے، اور اُنہوں نے اپنی جداگانہ شناخت کے ساتھ دینی مدارس قائم کیے ہیں۔ (مثال کے طور پر اہلِ سنت و جماعت کے بریلوی مکتبِ فکر میں ''دعوتِ اسلامی'' نے اپنے مدارس کا ایک سلسلہ قائم کیا ہے۔)

انیسویں صدی میں فارسی زبان کا چلن تھا، اگرچہ عامۃ الناس کی سطح پر اُردو اِس کی جگہ لے رہی تھی، تاہم قدامت پسندانہ زاویۂ نظر کے تحت دینی مدارس ابتدائی تعلیم کا آغاز فارسی زبان ہی سے کرتے تھے، اور ابتدائی عربی صرف ونحو، نیز فقہ وغیرہ میں فارسی متون پڑھائے جاتے تھے۔ طلبہ وقت کے ساتھ عربی زبان و ادب پر اِس حد تک عبور حاصل کرلیتے تھے کہ بعد میں فقہ، اصول فقہ، حدیث وتفسیر اور منطق و فلسفہ کو عربی متون کے ذریعے سیکھتے تھے، تاہم دینی مدارس میں عربی زبان و انشاء کی جانب عدمِ توجہ پر اعتراض کیا جاتا

رہا ہے۔ بہرحال گزشتہ پچاس ساٹھ برسوں میں بڑے مدارس میں اِس حوالے سے خاصی تبدیلی آئی ہے۔ فارسی بڑی حد تک مدارس کے نصاب سے خارج ہوگئی ہے، بلکہ اب تو صرف ونحو کے وہ متون جو فارسی میں تھے، اُن کے عربی تراجم کرلیے گئے ہیں، اور ذریعۂ تعلیم فارسی کی جگہ عربی ہوگیا ہے (مثال کے طور پر مفتی عنایت احمد کاکوروی کی ''علم الصیغہ'' اورارشادحسین مجددی رام پوری کی ''ارشادالصرف'' کے عربی تراجم بعض مدارس میں پڑھائے جارہے ہیں)، مزید برآں عرب دُنیا، اور بالخصوص مصر اور سعودی عرب کی جامعات نے مبعوثین کے ذریعے وطن عزیز کے مدارس میں عربی ادب و انشاء کو فروغ دیا ہے، اِسی طرح ایک معقول تعداد میں وہ اہلِ علم مدارس میں پڑھارہے ہیں جنہوں نے خود مصر اور سعودی عرب کی جامعات سے تعلیم حاصل کی ہے، اور عربی زبان پر اُن کی گرفت بہت مضبوط ہے۔

---

۱۵ اہلِ علم و دانش جن سے جناب ممتاز احمد نے گفت وشنید کی، اُن کے نام یہ ہیں: ● مولانا گلزار احمد مظاہری ● مفتی جمیل احمد تھانوی ● سیّد ابوبکر غزنوی ● ملک غلام علی ● مفتی محمد حسین نعیمی ● جناب جاوید احمد غامدی ● مولانا عبدالحق (اکوڑہ خٹک) ● مولانا محمد ایوب جان بنوری ● مولانا محمد ناظم ندوی ● مولانا احمد سعید ● مفتی محمد یوسف (بہ معیت مولانا عبدالرحیم) ● چودھری نذیر احمد ● مولانا خان محمد ● مولانا علی محمد مظاہری ● مولانا حامد علی خاں— یہ سبھی حضرات اہل سنت و جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ آٹھ دارالعلوم دیوبند کی روایت کے امین ہیں، مگر اِن میں سے تین اپنی سوچ اور زاویۂ نظر کے حوالے سے جماعتِ اسلامی کے قریب ہیں۔ باقی حضرات میں ایک اہلِ حدیث، دو بریلوی اور باقی چار اپنی تعلیم و تربیت اور اُٹھان کے حوالے سے کسی خاص دینی مسلک سے انتساب کے بجائے بنیادی اسلامی شناخت کو اہمیت دینے والے ہیں۔ جدید تعلیم کے حوالے سے دیکھا جائے تو جملہ حضرات میں سے پانچ اپنے دینی لگاؤ کے ساتھ جدید جامعات کے پڑھے ہوئے ہیں۔

رجحانات کے اِس اختلاف یا تنوع کے باوجود جناب ممتاز احمد کے تأثر کے مطابق: ''ایک چیز جو ان سب میں مشترک تھی، وہ اِن سب حضرات کا انکسار، تواضع اور علم تھا۔ یہ سبھی لوگ علم اور تقویٰ میں اپنے دور میں ممتاز ترین مقام پر فائز تھے۔ نہ صرف اپنے اپنے فرقے اور مسلک میں، بلکہ بلالحاظِ مسلک پورے ملک کے علمی اور دینی حلقوں میں ان کا احترام تھا۔ اس سب کچھ کے باوجود، ان حضرات میں نہ تو اپنے علم کا غرور تھا، نہ اپنے زہد وتقویٰ کا گھمنڈ۔ اُن کی گفتگو میں متانت تھی اور لہجے میں اعتدال وتوازن۔'' (ص ۸)

جناب ممتاز احمد نے ۱۹۷۵ء میں جمع کردہ معلومات کے ساتھ معتدل مزاج معروف دیوبندی عالم مولانا زاہدالراشدی کے ساتھ ۲۰۰۷ء، ۲۰۰۹ء اور ۲۰۱۰ء میں تبادلۂ خیال کی اپنی نشستوں کی روداد (بہ صورت سوال و جواب) دے کر اِس مطالعے کو up-date کردیا ہے۔ مولانا زاہد الراشدی نے ۱۱ستمبر کے بعد تسلسل کے ساتھ اِس موضوع پر گفتگو کی ہے، اخباری کالم لکھے ہیں، اور اپنی ادارت میں ماہنامہ ''الشریعۃ'' (گوجرانوالہ) میں بیسیوں مضامین شائع کیے ہیں۔ اُن کی یہ ساری تحریری یا ان کا کچھ حصہ کتابی صورت میں بھی شائع ہوا ہے، تاہم زیرنظر ''دینی مدارس: روایت وتجدید'' میں بھی اُن کے افکار و خیالات بصورت اختصار آ گئے ہیں۔

مختصر یہ کہ وطن عزیز کے ''دینی مدارس'' کے مالہ و ماعلیہ کو جاننے کی خواہش رکھنے والوں کے لیے اِس کتاب میں دلچسپی کا خاصا سامان موجود ہے۔

ایک صاحب، مولانا محمد ایوب جان بنوری نے توجہ دلائی ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں تاریخ کا مضمون شامل ہونا چاہیے (ص ۸۹)۔ اِس تجویز کے صائب ہونے میں کوئی شک نہیں کہ ایک بزرگ نے درسِ نظامی کو ''نظام الدین طُوسی'' سے منسوب کیا (صفحات ۱۵-۱۶)۔ غالبًا وہ نظام الملک طُوسی (م۱۰۹۲ء) کے مدارس کی جانب اشارہ کرنا چاہتے تھے۔ ایک دوسرے بزرگ نے مقصدِ تعلیم واضح کرنے کے لیے یہ حکایت بیان کی ہے: ''مدرسہ نظامیہ بغداد میں ہارون الرشید کے زمانے میں قائم ہوا تھا۔ روایت ہے کہ ایک بار خلیفہ ہارون الرشید مدرسہ میں گیا اور طلبہ سے پوچھنے لگا کہ وہ کس مقصد کے لیے اِس مدرسے میں تعلیم حاصل کررہے ہیں، ایک نے جواب دیا کہ میرا باپ محتسب کے عہدے پر فائز ہے، بس چاہتا ہوں کہ میں بھی پڑھ لکھ کر محتسب بن جاؤں اور اپنے والد کی جگہ لے لوں۔ دوسرے طالب علم نے کہا کہ وہ قاضی بننا چاہتا ہے، تیسرے نے کہا کہ میں مفتی بنوں گا، لیکن ہارون الرشید نے یہ سوال امام غزالی سے کیا، جو اُس وقت طالب علم تھے، تو انہوں نے کہا کہ وہ اِس لیے پڑھ رہے ہیں کہ اپنا دین درست کریں اور دوسروں کو بھی دین سمجھائیں۔'' (ص ۳۰)

اولاً تو مدرسہ نظامیہ ہارون الرشید کے زمانۂ خلافت (۱۷۰-۱۹۳ھ/ ۷۸۶-۸۰۹ء) میں قائم نہیں ہوا، بلکہ نظام الملک طوسی نے ۱۰۶۵ء میں اِس کی داغ بیل ڈالی تھی۔ (کسی مآخذ کا حوالہ دینے کی چنداں ضرورت نہیں، مدارس کی تاریخ پر لکھی گئی کسی بھی اچھی کتاب میں معلومات دستیاب ہیں۔) ثانیاً امام غزالی نے مدرسہ نظامیہ - بغداد میں تعلیم حاصل نہیں کی، البتہ وہاں مدرّس رہے تھے۔ ثالثاً ہارون الرشید کے زمانۂ

خلافت اور امام غزالی کے عہد (۴۵۰-۵۰۵ھ/ ۱۰۵۸-۱۱۱۱ء) میں تین صدیوں کا فاصلہ حائل ہے، واللہ اعلم، حضرت نے کس طرح زمانے کی طنابیں کھینچ کر ہارون الرشید اور امام غزالی کا مکالمہ مرتب کردیا!

کتاب میں جن علماء کے خیالات پیش کیے گئے ہیں، اُن کے سوانحی تعارف بھی دیے گئے ہیں۔ ان تعارفی تحریروں کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ بہت روا روی میں لکھی گئی ہیں۔

ناشر نے کتاب کے لیے کاغذ کے انتخاب، سرورق کی تیاری اور layout میں جس حسنِ ذوق اور ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے، وہ کتابت کے لیے خط کے انتخاب اور صحتِ کتابت میں ناپید ہے۔ علماء کے سوانحی تعارف اور متن میں ذیلی سرخیوں کے لیے جو خط پسند کیا گیا ہے، اِس میں ''ہ'' اور ''ھ'' میں فرق نہیں ہوسکا، جہاں الفاظ میں ''ب ہ'' اور ''ت ہ'' اور ''ک ہ'' یک جا آئے ہیں، وہاں یہ حروف ''بھ''، ''تھ'' اور ''کھ'' بن گئے ہیں۔ بہت ''بھت''، اجتہاد ''اجتھاد'' اور پہنچے ''پھنچے'' بن گیا ہے، مزید برآں جہاں ''ؤ'' لکھنا مقصود تھا وہاں ''ئو'' بن گیا ہے۔ داؤد ''دائود'' اور لاؤڈ سپیکر ''لائوڈ سپیکر'' کتابت ہوا ہے۔ اِس طرز کی اغلاط کے ساتھ کتابت کی عمومی اغلاط بہت زیادہ ہیں۔ بعض مقامات پر فقرے نامکمل رہ گئے ہیں۔ (صفحہ ۶۴، س ۲؛ صفحہ ۲۸، س ۱۶؛ صفحہ ۹۰، س ۱۵— ممکن ہے کہ عبارت کا کچھ حصہ بھی حذف ہوگیا ہو!)

مختلف علماء کے انٹرویوز میں اُن کی سوچ کے اہم نکات کو جلی قلم کے ساتھ اقتباسات کی شکل میں نمایاں کیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر احمد کی پگڑی محمود کے سر رکھ دی گئی ہے۔ (مولانا محمد ایوب جان بنوری کے انٹرویو میں صفحہ ۹۱ پر دیا گیا اقتباس مولانا محمد ناظم ندوی کے خیالات کا مظہر ہے، اور چوہدری نذیر احمد کے انٹرویو میں صفحہ ۱۴۷ پر نقل کردہ اقتباس مولانا خان محمد کے ذہن کا عکّاس ہے۔)

کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے قابلِ مطالعہ ہے، اور ایمل مطبوعات -اسلام آباد کی صوری خوش نمائی کی مظہر ہے۔

❁❁❁❁❁